اُردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:3، شمارہ:1 (جنوری تا جون 2025ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ڈاکٹر افشاں بتول

پی ایچ ڈی اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

فرحت پروین کے افسانے کا مارکسی تنقیدی تناظر

Dr. Afshan Batool
Ph.D Urdu, International Islamic University, Islamabad

Marxist Critical Perspective of *Farhat Parveen's* Short Story

ABSTRACT

This paper critically examines Farhat Parveen's short story "Aankhein Na Kholna" through the lens of Marxist literary theory. It explores how Karl Marx's foundational concepts such as class struggle, alienation, materialism, and dialectical thinking can be applied to literary texts to reveal the underlying socio-economic structures and power dynamics. The story is analyzed as a reflection of a class divided society, where the ruling bourgeoisie exploits the labor and dignity of the proletariat. The narrative shows how systemic injustice is internalized by the oppressed, often justified as fate, which Marx termed "ideological conditioning." Thinkers like Engels, Althusser, Lenin, and Gramsci are referenced to explain how literature serves as a tool of both resistance and control. The article argues that Marxist criticism demands literature to side with the marginalized and portray the lived realities of the working class. Farhat Parveen's story, through the tragic depiction of class disparity and societal apathy, becomes a powerful critique of capitalist ideology and a call for awareness and change. Thus, literature is not viewed merely as an artistic endeavor but as an active participant in social transformation.

Key words: *Karl Marx, Engels, Althusser, Class struggle, Alienation, Dialectical thinking, Socio-Economic structures , Power dynamic, Farhat Parveen, Ankhein Na Kholna, Urdu short stories*

کارل مارکس (1883ء–1818ء)اور اس کے رفیق کار فریڈرک اینگلز (1895ء۔1820ء) نے اپنے فلسفیانہ نظریات وخیالات سے سماجی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اپنے فکر و عمل سے سرمایہ دارانہ نظام کی جانچ پر کھ کر کے ایک ایسے تصور کی بنیاد رکھی جسے دنیا مارکسیت کے نام سے جانتی ہے۔مارکس ہیگل کے فلسفیانہ خیالات سے متاثر تھے۔1835ء تک مارکس نے جرمنی کے شہر ٹرائر کے ایک مقامی سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔بی اے کی ڈگری انہیں ایک مضمون "پیشہ اختیار کرنے کے متعلق ایک نوجوان کے تصورات "پر دی گئی۔یہ مضمون مارکس کے

ذہنی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔اس مضمون میں مارکس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر انسان کو اپنی پیشے کے انتخاب کے وقت انسانیت کی بھلائی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔مارکس کا دعویٰ ہے کہ اگر ہم اپنی کمر کو بھاری بوجھ کی وجہ سے جھکنے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے جس میں ہمیں انسانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع مل سکے۔

مارکس نے بون اور برلن کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔برلن میں ہی قانون کا امتحان پاس کیا۔ جب بون یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں ملازمت کوشش کے باوجود نہ مل سکی تو مارکس نے صحافت میں طبع آزمائی کا فیصلہ کیا اور رہائی نش زائی تونگ نامی اخبار سے منسلک ہو گئے۔مارکس نے اس اخبار کے توسط سے جو مضامین لکھے ان کی خوب پزیرائی ہوئی۔ آزادی صحافت کے حوالے سے وہ سنسر شپ کی مخالفت کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ سنسر شپ پریس کو یہ باور کرواتا ہے کہ تم بیمار ہو اور حکومت تمہاری طبیب ہے۔ان کی ایسی تحریروں کی وجہ سے حکومت نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں۔مارکس کے لیے ان حالات کی وجہ سے جرمنی میں رہنا دشوار ہو گیا تو انھوں نے پیرس کا رخ کیا۔ پیرس میں انکی ملاقات فریڈرک اینگلز سے ہوئی۔اس وقت سے لے کر تادم حیات دونوں کے خیالات میں زبردست ہم آہنگی رہی۔ کارل مارکس پر انکی تحریروں کی وجہ سے مختلف اوقات میں مقدمات چلتے رہے حتیٰ کہ فرانس میں انکے اخبار کو بھی بند کر دیا گیا اور ان کو جلاوطنی کی سزا سنادی گئی۔ دسمبر 1847ء میں کارل مارکس اپنے اہل خانہ اور اینگلز کے ہمراہ بیلجیئم منتقل ہو گئے۔بیلجیئم جانے سے پہلے کارل مارکس اور اینگلز نے برطانیہ کا دورہ کیا تو وہاں کے مزدوروں کے حالات نے ان کی حساس طبیعت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب محنت کش طبقے کی حالت یہ تھی کہ ان کے ہاں جوتے پہننے کو عیاشی سمجھا جاتا تھا۔کمسن لڑکیوں کی شادی صرف اس بنا پر جلدی کر دی جاتی تھی کہ خاندان کا بوجھ ہلکا ہو سکے اور سب سے ترحم آمیز بات یہ تھی کہ مائیں کام پر جانے سے پہلے اپنے بچوں کو نشہ آور ادویات کھلا جاتیں تا کہ ان کی واپسی تک ان کے بچے بھوکے، پیاسے بے خبر سوتے رہیں۔

1848ء میں مارکس نے اینگلز کے ساتھ مل کر ایک کتابچہ تحریر کیا تھا جس میں محنت کش اور مظلوم طبقے کو متحد ہو جانے کا پیغام دیا۔اس کتابچے کا نام کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو تھا جو کہ پہلی دفعہ جرمن زبان میں لندن سے شائع ہوا۔ یہ مینی فیسٹو کمیونسٹ لیگ (مزدوروں کی بین الاقوامی جماعت) کے ایک مفصل اور نظریاتی پروگرام کے طور پر شائع ہوا۔ یہ اگرچہ مارکس اور اینگلز نے مل کر لکھا تھا مگر اس کے دیباچے میں اینگلز نے اس بات کی وضاحت کی کہ اس مینی فیسٹو کا مرکزی تصور کارل مارکس کا تھا اور وہ تصور یہ تھا کہ کسی بھی معاشرے میں معاشی پیداوار اور اس کا تبادلہ ہی اس کا سماجی و تہذیبی ڈھانچہ بناتا ہے اور اسی ڈھانچے پر اس معاشرے کی سیاسی و ذہنی اقدار پروان چڑھتی ہیں۔اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مظلوم طبقہ اس وقت تک استحصالی طبقے کی انانیت اور زیادتی سے نہیں بچ سکتا جب تک کہ پورے معاشرے کو ظلم و زیادتی، ناانصافی اور طبقاتی کشمکش سے پاک نہ کر لیا جائے۔مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف بہت

کچھ لکھا لیکن اس کی زندگی بھر کی کاوش کا حاصل ان کی کتاب داس کیپیٹل Das Kapital (1867ء) بہ موسوم "سرمایہ" ہے۔ کارل مارکس اور اس کتاب کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن دربغل دارد کتاب[1]

اس کتاب میں جاگیر دارانہ نظام کے استحصالی طریقوں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ کس طرح محنت کشوں کی محنت کا سرمایہ دار کم معاوضہ دے کر ان کی محنت کا پھل خود کھاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حمائتی کئی صدیوں سے مارکس کے دعووں کی تردید میں لگے ہوئے ہیں مگر جو کچھ مارکس نے بیان کیا ہے وہ اس کے اپنے ذاتی تجربات کا نچوڑ ہے۔ ان کو بے سروپا دلیلوں سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ہیگل کے نظریہ تصوریت کے خلاف انیسویں صدی کے وسط میں پہلی بار رد عمل کا آغاز کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی طرف سے ہوا۔ ہیگل کا فلسفہ، قدیم یونان کے خیال پر مبنی ہے کہ اس کائنات میں کوئی شے بھی ساکن نہیں ہر شے متحرک ہے۔ ہر شے اپنی صورت تبدیل کرتی ہے اور پہلے سے بہتر صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ چناں چہ حقیقت ارتقا پذیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہیگل نے حقیقت کو تصوراتی قرار دے کر اس کو وجودِ مطلق تک محدود رکھا جب کہ مارکس نے اس کا رشتہ مادیت کے ساتھ استوار کر کے اسے ایک نئے انقلاب سے دوچار کر دیا اور جدلیت کا تصور پیش کیا۔ مارکس کا یہ تصور جدلیت متضاد اکائیوں کے تصادم سے کائنات کے ہر عمل کو پرکھتا، جانچتا اور تشریح کرتا ہے۔ ہر اکائی جوابی اکائی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور پھر ان کے باہمی اختلاط کے نتیجے میں تیسری اکائی جنم لیتی ہے اور یہیں سے مارکس کائنات کی حرکتی تعبیر کے فلسفے کو تاریخ سے جوڑتا ہے اور سماج کی حرکت کے قوانین کی روشنی میں اس معاشی نظام کی وضاحت کرتا ہے جو کہ سرمایہ کی طاقت سے قائم ہوا ہے۔ اس بات کی وضاحت مارکس نے خود اپنی کتاب 'داس کیپیٹل" (1873ء) طبع دوم کے دیباچے میں کی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

" ہیگل (George Wilhelm Hegal 1770-1831) پہلا شخص ہے جس نے جدلیت کے طریقہء عمل کو جامع ومانع اور مکمل طرز میں پیش کیا۔ جدلیت ہیگل کے ہاں سر کے بل کھڑی ہے۔ اب اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ابہامیت کے خول سے صحیح فکری گرہ کو نکال دیں تو جدلیت کو بالکل پلٹ کر ٹانگوں کے بل کھڑا کر دیجیے۔[2]

مارکس نے انسانی سماج کی اقتصادی پیداوار اور ملکیت کا ڈھانچہ معلوم کیا اور سائنسی انداز میں ان کی درجہ بندی کی جو کہ دراصل جدلیاتی مادیت کی درجہ بندی ہے۔ مارکس نے اسی جدلیاتی مادیت کے فلسفے کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صف آرا ہو کر اس دنیا کے سماجی نظام کو بہت حد تک متاثر کیا اور ایک ایسا نظام فکر دیا جو سماجی نظام کو بہتر طور پر جاننے اور اس کو مزید بہتر بنانے کے اصول مہیا کرتا ہے۔ مارکسیت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں

اقتصادی پیداوار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماج کا ڈھانچہ اس دور کے لوگوں کی سیاسی اور ذہنی اقدار کے لیے بنیاد قرار پاتا ہے یعنی کہ کسی بھی سماج کی اقتصادی بنیادیں جو ڈھانچہ بناتی ہیں وہی تمام لوگوں کے طرز عمل کی بنیاد بنتا ہے۔
مارکس اپنی کتاب کمیونسٹ مینی فیسٹو کے باب اول کے شروع میں لکھتا ہے:" تمام انسانی سماج کی تاریخ طبقاتی تاریخ کی جدوجہد ہے"۔[3]یعنی ہر سماج کی اقتصادی بنیادوں میں ہی اس عہد کے سماج کی تاریخ پوشیدہ ہے اور ہر سماج میں برسر اقتدار طبقے کے افکار و خیالات کی ہی کار فرمائی نظر آتی ہے مگر اس کے باوجود ان با اقتدار طبقوں کے خلاف پیدا ہونے والی تحریکیں بھی اہم مقام رکھتی ہیں کیوں کہ مارکس کے خیال میں لوگوں کے خیالات و احساسات ہی سماج میں تبدیلیاں لانے کا موجب بنتے ہیں۔اسی لیے ان برسر اقتدار قوتوں کے خلاف مختلف ادوار میں تحریکیں جنم لیتی رہی ہیں۔جس طرح غلام سماج کے دور میں غلاموں نے اپنے آقاؤں سے بغاوت کی تھی۔یہ الگ بات کہ برسر اقتدار طبقہ ان تبدیلیوں کو منظر عام پر آنے دینے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتا ہے۔اس طرح کچھ لوگ مسلسل محنت اور عمل پیہم سے اپنے ہنر سے اشیا کی پیداوار بڑھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔اس طریقہ سے بھی ذرائع پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔اس طرح سماج میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے اور اہم بات یہ کہ کسی کو ان تبدیلیوں کا ادراک بھی نہیں ہو پاتا۔اسی طرح سماج کی تبدیلیوں کا یہ تانا بانا بنتا چلا جاتا ہے۔مارکس کا یہ نظریہ انسانی سماج کے ارتقا کا ایک انقلابی اور سائنٹیفک نظریہ ہے۔انسانی سماج کے ارتقا کے اس عمل میں مختلف وجوہات کی بنا پر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔وہ بھی ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانے سماج کی بنیادیں جب کھوکھلی ہو جاتی ہیں تو پھر نئی اقتصادی بنیادوں پر نیا سماجی ڈھانچہ بنتا ہے۔یہ ایک المیہ ہے کہ ہر سماجی ڈھانچے میں ہمیشہ سے دو طبقوں (امیر و غریب) کے درمیان طاقت و اقتدار کی جدوجہد جاری رہتی ہے جو کہ در حقیقت سیاسی و معاشی فوائد کے حصول کی جنگ ہوتی ہے۔اس جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش ہمیشہ سے غریب طبقے کے استحصال کی ہی خبر لاتی ہے۔اس استحصال کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ استحصالی طبقے کے لوگوں میں اپنی ذات اور اپنے حقوق کے بارے میں بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے جس کو بنیاد بنا کر مارکس نے "بیگانگی" کی اصطلاح اپنی کتاب داس کیپیٹل میں استعمال کی ہے غریب طبقہ سماج کی اس طبقاتی تقسیم سے سمجھوتہ کر لیتا ہے یعنی جو کچھ ہو رہا ہے خواہ وہ غیر فطری ہی کیوں نہ ہو،اس کو تسلیم کر لیتا ہے مارکس کے ہمنوا اینگلز نے اس کو false consciousness کا نام دیا ہے یعنی کہ غریب طبقے کی سوچ کچھ اس طرح مفقود کی جاتی ہے کہ وہ حقیقی معاشی اور سماجی صورتحال کا ادراک ہی نہ کر پائے۔
مارکس کا خیال ہے کہ ہمارا معاشرہ دو بنیادی طبقات میں منقسم ہے۔ان میں سے ایک مظلوم طبقہ ہے اور دوسرا استحصالی طبقہ۔مارکس استحصالی طبقے کو بورژوا کہتا ہے اور ہے اور مظلوم و محنت کش طبقے کو پرولتاری۔مارکسیت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ کہ بورژوا طبقے نے ہمیشہ پرولتاریوں کی حق تلفی کی ہے۔ان سے کم اجرت کے عوض زیادہ محنت لے کر ان

کو معاشی بدحالی کا شکار بنادیا ہے۔ ہمیشہ محنت کشوں کی محنت کا پھل حکمران طبقے نے خود کھایا ہے جس کی وجہ سے حکمران طبقہ دن بدن امیر تر اور محکوم طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو Communist Manefesto(1888ء) کے انگریزی ایڈیشن کے دیباچے میں اینگلز حاشیے میں لکھتا ہے :

" بورژوا جدید سرمایہ داروں کا طبقہ ہے جو سماجی پیداوار کے ذرائع کے مالک ہیں اور مزدوروں سے اجرت پر کام لیتے ہیں۔ پرولتاری موجودہ زمانے کا، اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کا طبقہ ہے جس کے پاس اپنا کوئی ذریعہ ءپیداوار نہیں اور جسے زندہ رہنے کے لیے اپنی طاقت، محنت بیچنی پڑتی ہے۔ " (4)

مارکسیت طبقاتی کشمکش سے پاک سماج کی تشکیل پر زور دیتی ہے جس میں اقتصادی پیداوار سب کی مشترکہ ملکیت ہو۔ مارکسیت ایک مادی فلسفہ ہے جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس دنیا سے پرے کوئی اور طاقت نہیں ہے جہاں دیگر فلسفے اس دنیا کو سمجھنے کی بات کرتے ہیں وہاں مارکسیت دنیا کو اس انداز سے اپنانے کی بات کرتی ہے جس سے دنیا کو تبدیل کیا جاسکے۔ مارکس پوری دنیا کے محنت کشوں کو متحد ہو جانے کی تلقین کرتا ہے تاکہ اقتدار کی قوت پرولتاریوں کے پاس آجائے اور ایک صحت مند و توانا سماج وجود میں آجائے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے آخر میں مارکس کہتا ہے کہ

" کمیونسٹ برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد اس وقت پورا ہو سکتا ہے جب موجودہ سماجی نظام کا تختہ بزور الٹ دیا جائے۔ حکمران طبقے کمیونسٹ انقلاب کے خوف سے کانپ رہے ہوں تو کانپیں۔ مزدوروں کو اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے؟ اور جیتنے کو ساری دنیا پڑی ہے۔ "(5)

مارکس نعرہ بلند کرتا ہے کہ "دنیا کے مزدورو، ایک ہو جاو۔ "(6) مارکس کے ان الفاظ کی گونج آج پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ ان الفاظ نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا وہاں ادب اور تنقید کے میدان میں بھی نئے در وا ہوئے۔ زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی کرنے والا ادب مارکس کے نزدیک اچھا ادب ہے۔ اس کے خیال میں ادب کا مقصد محض تفنن طبع ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ خلا میں تخلیق ہوتا ہے بلکہ ادب کو معاشرتی طبقات کی کشمکش کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ادب و شعر کے متعلق الہامی، رومانی، ماورائی اور مابعد الطبعیاتی نقطہ نظر کو چھوڑ کر انھوں (مارکس) نے مادی نقطہ نظر کو اپنایا اور اس کو تاریخی سماجی اور عمرانی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس (ادب) کو صرف تفریح طبع کا باعث نہیں سمجھا بلکہ سماجی عمل قرار دیا جس کا بڑا مقصد سماجی و اصلاحی ہے۔[7] ادیب اور شاعر اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے برعکس زیادہ سماجی شعور رکھتے ہیں۔ اسی شعور کی بدولت وہ اپنی تخلیقات میں سماجی حالات اور طبقاتی تقسیم کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں یہ ہی وہ مقام ہے جہاں ادب اور مارکسیت آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ اسی لیے مارکسیت مطالبہ کرتی

ہے کہ ادب کو امیر و غریب کے مابین پائی جانے والی طبقاتی کشمکش میں غریب اور پسے ہوئے پرولتاری طبقے کا ساتھ دینا چاہیے"۔[8]

مارکسی نقاد کے نزدیک کسی بھی فنکار کا وہ فن پارہ ہی تنقید کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے جس کا مرکز سماج ہو یعنی کہ اس فن پارے میں داخلی جذبات کی عکاسی کی بجائے خارجی حالات کا بیان ہو۔اس میں معاشرے کی سچی عکاسی ہو۔ طبقاتی الجھن کا ترجمان ہو۔ اگر کوئی ادب پارہ رومانویت کا عکاس ہو تو مارکسی نقاد اسے اس بنا پر مسترد کر دیتا ہے کہ ایسے ادب کا کوئی فائدہ نہیں جس میں غریب عوام کی ترجمانی نہ ہو۔ دراصل مارکسی نقاد سماجی طبقات کے درمیان پائی جانے والی کشمکش کی بات کرتے ہیں۔ان طبقات کی ثقافت اور ان کے ذہنی رویوں کی بات کرتے ہیں۔ادیبوں اور شاعروں کے عصری شعور کو پرکھتے ہیں۔ان کا مقصد ادب کو خواب وخیال کی طلسماتی دنیا سے نکال کر حقیقی زندگی کے خارجی عوامل سے پیوستہ کرنا ہے تاکہ سماج کے دونوں طبقات کی ادب پارے میں سچی ترجمانی ہو سکے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مارکس اور اینگلز نہ تو ادیب تھے اور نہ ہی نقاد بلکہ انھوں نے تو استحصالی طبقے کی چال کو بے نقاب کرنے کی سعی کی تھی لیکن یہ سچ ہے کہ ان کے معاشی و اقتصادی نظریات و عقائد محدود نہیں تھے بلکہ پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔مارکس نے پہلی بار زندگی کا مادی تصور پیش کیا جس کا بعد میں سوویت جمہوریہ اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے بانی، بالشویک پارٹی کے رہنما اور روس میں انقلاب کے منتظم ولادیمیر لینن Vladimir Lenin (1924ء-1870ء) نے پرچار کیا۔ لیئن ٹراسٹکی Leon Trotsky (1940-1879) نے لینن کے بارے میں کہا تھا:

"لینن وہ پہلا انسان ہے جس نے مارکس کے داس کیپیٹل کو پوری طرح سے اپنے مغز استخوان میں اتار لیا"[9]

لینن نے اپنی انقلابی آواز اور سچے لہجے کے ساتھ ادب پر اظہار خیال کیا اور ادب کو سوشل ڈیموکریٹک متحدہ مزدوروں کی تنظیم کا باقاعدہ حصہ بنانے کی کوشش کی اور اشتراکی حقیقت نگاری کا پرچار کیا۔اپنی تحریروں میں لینن نے مردہ تاریخی تجرید کو زندہ انسانوں کے معاشرے پر مسلط کرنے کی بجائے سماج کی مختلف قوتوں کا صحیح تجزیہ کیا اور عالمی سرمایہ داری کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر ادب و نقد کو سیاست سے جوڑنے پر زور دیا۔ چینی قوم کے ایک فلسفی ماؤزے تنگ (Mao Tse Tung 1893-1976) کا کہنا ہے:

"میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے شاعروں اور فنکاروں کو تخلیقی امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہیے لیکن مارکسزم لینن ازم تو ایک سائنس ہے جس کا ہر انقلابی کو مطالعہ کرنا چاہیے اور ادیب و شاعر حضرات اس سے مبرا نہیں۔ مصنفوں اور ادیبوں کو اپنے سماجی ڈھانچہ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ سماج جن طبقات پر مشتمل ہے ان کو بھی دیکھنا

چاہیے اور پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مختلف طبقات کا آپس میں کیا رشتہ ہے ؟ مختلف طبقات کے حالات و کوائف ان کے انداز فکر اور ان کی نفسیاتی کیفیت کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔ان تمام عوامل کے اچھی طرح جان لینے کے بعد ہی وہ ہمارے ادب و فن کو بھرپور معنی دے سکتے ہیں۔" (10)

لوئس التھسر (Louis Althusser) کو 1960ء کے بعد مارکسزم اور پس مارکسزم کے مباحث کی وجہ سے بہت پذیرائی ملی۔اس کے افکار و خیالات ادب پر بھی اثر انداز ہوئے اور ان سے مارکسی تنقید بھی متاثر ہوئی۔ اس نے مارکسزم کو اپنے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا۔التھسر نے جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کے درمیان فرق اور باہمی ربط کو واضح کیا اور سائنس اور فلسفہ کے ساتھ ان کا تعلق معلوم کیا۔التھسر سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط والے معاشرے میں ادب اور ثقافت کی ترجمانی کرتا ہے۔ادب اور فنون لطیفہ کے تصورات میں مارکس اور التھسر کے نظریات میں ایک حد فاصل موجود ہے۔اس نے سماجی نظام کی بجائے سماجی تشکیل کی بات کی۔ (11)

التھسر ریاستی طاقت اور ریاستی کنٹرول کے مابین فرق کو واضح کرتا ہے۔ریاستی طاقت کو التھسر کی اصطلاح میں "حرکی ساختوں" سے بحال کیا جاتا ہے جو کہ عدالتیں ،فوج اور پولیس کے ادارے ہیں جو کہ آخری تجزیے میں بطور بیرونی طاقت کے عمل کرتی ہیں لیکن ریاست کی طاقت کو زیادہ ارفع طریقے سے یوں بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کے شہریوں کے درمیان درونی اتفاق موجود ہے جسے التھسر نظریاتی ساختیں کہتا ہے۔بہت سے گروپس جیسے کہ سیاسی پارٹیاں،سکولز،میڈیا،چرچز،خاندان کا تصور اور قانون نظریہ کو طاقت پہنچاتے ہیں جو کہ نظریات اور رویہ جات کا ایک سیٹ ہوتا ہے جو کہ ریاست کے مقاصد کی طرف ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے اور سیاسی سٹیٹس کو برقرار رکھنے کا حامی ہوتا ہے۔ چناں چہ ہم میں سے ہر کوئی آزادی سے اس جبر کا انتخاب کرتا ہے جو درحقیقت ہم پر زبردستی تھوپ دیا گیا ہوتا ہے۔ (12)

آج کل کے دور میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی اور دیگر مادی وسائل کی فراہمی نے انسانی معاشرے کو ترقی کی ایسی منازل سے روشناس کروادیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن ساتھ ساتھ اگر تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالی جائے تو جو حقیقت ہم پر منکشف ہوتی ہے اس نے ہر حساس انسان کو ورطہ ء حیرت میں ڈال دیا ہے اور وہ رخ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی بہت بڑی اکثریت معاشرتی ترقی کی ان منازل تک نہیں پہنچ پارہی۔ کارل مارکس نے سب سے پہلے غریب، محنت کش، مزدور اور استحصالی طبقے کے درمیان صدیوں سے جاری اس معاشرتی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کے خلاف آواز بلند کی اور محنت کش طبقے کے حقوق کا پرچار کیا۔مارکس نے معاشرتی اور اقتصادی نظام کے درہم برہم ہونے کی اصل وجہ پرولتاری اور بورژوا طبقے کے درمیان فرق کو قرار دیا۔ مارکس نے ان دونوں طبقوں کے مابین اس

جدوجہد کو کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو میں ،جو اس نے اینگلز کے ساتھ مل کر مزدوروں کی جماعت کے لیے 1948ء میں لکھا تھا۔Class conflict یا طبقاتی کشمکش کا نام دیا۔مارکس نے اپنی بات کی دلیل کے طور پر بتایا کہ ہم چاہے جتنی بھی پرانی تاریخ کو کھنگال لیں ہر ایک میں ہمیں سماج ان ہی دو بنیادی طبقات میں بٹا ہو نظر آئے گا۔اپنی اس جنگ کے نتیجے میں کبھی تو سماج کی نئے سرے سے تعمیر کی صورت نظر آتی ہے تو کبھی دونوں طبقے ہی اس جنگ کی آگ کی لپیٹ میں آ کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بورژوا طبقے نے ہمیشہ پرولتاری طبقے پر اپنا تسلط قائم رکھا ہے۔ان کی محنت کا پھل خود کھایا ہے اور ان کو زیادہ محنت کے عوض کم معاوضہ دے کر معاشی بدحالی کا شکار بنا دیا ہے۔

فرحت پروین کا افسانہ "آنکھیں نہ کھولنا" بھی ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس میں طبقاتی فرق کو بڑے حساس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔مارکسی نقطہء نظر میں ادب کو ایسا ہونا چاہیے جو پرولتاری طبقے کی حمایت میں لکھا جائے۔مارکسی تنقید یہ سوال اٹھاتی ہے کہ کیا فن پارہ طبقاتی جدوجہد میں بورژوا طبقے کی مخالفت کرتا ہے یا حمایت ؟مارکسی تنقید اس فن پارے کو اہمیت نہیں دیتی جس میں سماجی حالات وواقعات کے بدلتے ہوئے مزاج اور طبقاتی تقسیم کا بیان نہ ہو۔مارکسی تنقید کے نزدیک وہ فن پارہ عوام دوست نہیں ہو سکتا جو پرولتاری طبقے کا ساتھ نہ دے۔یہ تنقید فن پارے سے سماجی اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے اور ادب کو افادی اور مقصدی پہلوؤں کی تلاش کا کام سونپتی ہے۔زیر نظر افسانے "آنکھیں نہ کھولنا" میں بھی بورژوا طبقے کے استحصالی عمل پر کڑی تنقید کی گئی ہے جب کہ پرولتاری طبقے کی زبوں حالی کی دردمندی کے ساتھ حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے اور غیر جانبداری و بے باکی سے غریب عوام کے جذبات و احساسات، تمناؤں اور حسرت کو پیش کیا ہے۔یہ دو دوستوں کریم بخش اور دلدار کی کہانی ہے جو کہ غربت کے باوجود اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھے۔ دلدار، اسکی بیوی تابی اور بیٹی شہزادی پکی سڑک پر جا رہے تھے جب ایک امیر آدمی کی بڑی سی چمچماتی کار بے قابو ہوتی ہوئی ان سے جا ٹکرائی۔اس امیر آدمی نے انہیں شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کروا دیا۔گاوں کے سبھی لوگ اس بڑے آدمی کی تعریف کر رہے تھے کہ کیسا سخی بندہ تھا۔چاہتا تو بھاگ جاتا۔سارا الزام خود اپنے سر لے لیا اور ہسپتال بھی لے گیا۔اب اگر ان کی تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا تو اس بھلے آدمی نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔کریم بخش نے موبائل فون سے کار والے سے رابطہ کیا۔ہسپتال بھی اسے آسانی سے مل گیا۔وہ تینوں انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھے۔ہسپتال واقعی شاندار تھا۔اس بھلے آدمی نے ہسپتال کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھالی۔کریم بخش کڑھتا تھا کہ دولت بھی کیسی عجیب چیز ہے، کون کہتا ہے کہ اس سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی۔وہ امیر آدمی ایک ہنستے کھیلتے کنبے کو لاشوں میں بدل کر اپنے ضمیر کا اطمینان خرید کر چلا گیا۔اس کے دل کو کسی کل چین نہ آتا۔ہر دوسرے تیسرے دن ہسپتال پہنچ جاتا۔شہزادی کے دماغ میں چوٹیں آئی تھیں اور وہ دائمی بے ہوشی میں چلی گئی تھی۔دلدار کی کئی ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔تابی کی حالت ان دونوں سے قدرے بہتر تھی۔وہ میاں بیوی مختلف آپریشنوں سے گزرتے رہے اور شہزادی

سوئے ہوئے محل کی شہزادی کی طرح سوتی رہی۔ کریم بخش کو ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ تمھارا دوست دلدار، کسی بھی لمحے ہوش میں آکر آنکھیں کھول دے گا۔ کریم بخش گھبرا کر دوست کے سرہانے پہنچا کہ کہیں وہ ہوش میں تو نہیں آ گیا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر اسے ایک گونہ اطمینان ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ اپنے دوست کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے مخاطب کر کے بولنے لگا۔

میں جانتا ہوں تم بے ہوش ہو۔ بے بس ہو۔ میری کوئی بات سن نہیں سکتے مگر مجھے وہ سب باتیں کہنے دو جو میں کسی اور سے کہہ نہیں سکتا ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" تمھیں معلوم ہے نا، ہمارا بچپن، ہمارا لڑکپن، ہماری جوانی اور ہماری یادیں مشترک ہیں۔ یاد ہے گرمیوں کا وہ دن، جب تم دریا میں گرے تھے اور میں پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا: "بچاؤ بچاؤ"۔ دینو گوالے نے تمھیں بچایا تھا لیکن ساتھ ہی ہمارے گھر والوں سے ہماری شکایت بھی کر دی تھی"۔ یہ یاد کرتے ہوئے کریم دین کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ تھی مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر سیاہی چھا گئی اور آنکھیں دھندلا گئیں۔ کاش! تم اسی روز ڈوب جاتے تو آج تمھیں یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ میرے بدنصیب دوست! تم تو اس بات سے بھی بے خبر ہو کہ پچھلے ہفتے تمھاری تابی کو میں مٹی کے حوالے کر چکا ہوں۔ اسے کار کے حادثے نے نہیں مارا بلکہ اس خبر نے مارا ہے جو تم سن لیتے تو دیوانے ہو جاتے۔ تابی بڑی تیزی سے صحت مند ہو رہی تھی، جب ایک دن ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ کیا تمھاری بیٹی حاملہ ہے؟ تابی کی روتے روتے آواز پھٹ گئی اور وہ اتنی زور سے چیخی کہ وارڈ گونج اٹھا۔ دماغ کی رگ پھٹنے کے بعد وہ اس غلیظ دنیا کو چھوڑ گئی۔ شہزادی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسی ہسپتال کے عملے کے کسی آدمی کی کارستانی تھی لیکن ہسپتال والے اپنی نیک نامی بچانے کے لیے اس بات کو دبانا چاہ رہے تھے۔ میں نے بات کرنا چاہی لیکن غریبوں کی آواز شاید امیروں کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ کاش! وہ امیر آدمی اپنے ضمیر کا اطمینان نہ خریدتا۔ تم تینوں بھی اسی طرح مر جاتے جیسے ہم غریب لوگ مرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں ہسپتال والے کسی بھی لمحے شہزادی کو زہر کا ٹیکہ لگا کر اپنے ہسپتال کی نیک نامی بچا لیں گے۔" اور اب ڈاکٹر مجھے خوش خبری سنا رہا ہے کہ تم کسی بھی لمحے آنکھیں کھول دو گے، کیا دیکھو گے آنکھیں کھول کر۔ دلدار کی پلکیں تھرتھرائیں اور کریم بخش ہسٹریائی انداز میں چلایا: "نہیں یار، آنکھیں نہ کھولنا۔۔۔ آنکھیں نہ کھولنا" اس دوران کمرے میں داخل ہوتی ہوئی نرس نے ہارٹ مانیٹر حیرت سے دیکھا۔ ایک متوازن رفتار سے ابھرتی ڈوبتی لائن سیدھی اور ساکت ہو گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے چل دی۔ مریض کے واحد دوست اور خبر گیر کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی جو مریض کا ہاتھ پکڑے زار و قطار روتا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ مارکسیت سماجی طبقات کے درمیان طاقت کے حصول کی کشمکش کو بیان کرتی ہے۔ اس کی رو سے معاشرے میں یہ طبقاتی کشمکش اس حد تک رچ بس گئی ہے کہ امیر طبقے کی ہر خطا اس کی دولت اور طاقت کی بنا پر خطا تصور نہیں کی جاتی جب کہ غریب طبقہ

بے خطا ہوتے ہوئے بھی سزا کا حقدار قرار پاتا ہے۔ امیر لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ جب چاہیں غریبوں اور مظلوموں کو اپنی طاقت سے کچل سکتے ہیں۔ دلدار کا دوست کریم بخش اس پوری کہانی میں اسی معاشرتی ناہمواری پر کڑھتا رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ غریبوں کی گھٹی میں ہی یہ بات ہی اس طرح ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو غریب تسلیم کر لیں اور اللہ کی اس تقسیم سے راضی برضا ہو جائیں۔ "ہم غریب لوگ بھی کیسے بھولے ہوتے ہیں۔ کیسے ہر ظلم اور زیادتی کو تقدیر سمجھ کر صبر سے سہہ لیتے ہیں۔"(13)

کارل مارکس کے مطابق اسے Ideal Conditioning کہا جاتا ہے۔ یہ حکومتی جماعت کے حکومتی خیالات (Ruling Ideas Of Ruling Class) ہیں۔ آئیڈیالوجی کی اس تعریف میں کم و بیش مادی نظام یعنی Material Infra Structure کی جھلکار نظر آتی ہے۔ ان خیالات و نظریات کے مطابق لوگوں کی ذہن سازی اس طرح سے کی جاتی ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ جو ہو رہا ہے وہ صحیح ہے۔ سب کچھ جیسا ہے اسے اسی طرح قبول کر لیا جائے۔ مارکس اس سسٹم پر بھی اعتراض کرتا ہے۔ اس کے خیال میں غریبوں کے دماغ میں بچپن سے ہی یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ غریبی اور امیری اپنی اپنی قسمت ہے۔ اس پر صبر اور شکر کرنا چاہیے۔ اس طرح کی غیر فطری باتوں کو تسلیم کر لینا مظلوم طبقے کی عادت بن چکا ہے۔ اسی لیے تو حادثے کے بعد جب دلدار اور اس کے کنبے کو ہسپتال منتقل کروایا جاتا ہے تو سب لوگ امیر آدمی کو خدا ترس کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ دلدار لوگوں کی قسمت میں ہی یہ لکھا تھا ورنہ اس بھلے آدمی نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ اس امیر آدمی نے ایک ہنستے کھیلتے کنبے کو لاشوں میں بدل کر رکھ دیا۔ اس کی تو سخاوت اور نیک دلی کے چرچے ہوتے رہے جب کہ دلدار اور اس کے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ان کی تقدیر تھا۔ مارکس کے رفیق کار اینگلز نے اسے False Consciousness کا نام دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غریب آدمی کی ذہن سازی اس طرح سے کی جائے کہ وہ اپنی موجودہ صورتحال میں معاشرتی ناہمواری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کا ادراک ہی نہ کر پائے بلکہ اسے قسمت کا لکھا سمجھے اور قبول کرے۔ محنت کش اور مزدور طبقہ اپنے معاشی اور شخصی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کے قابل نہ رہے۔ مارکس کہتا ہے: آخر سرمایہ دار طبقہ غریبوں کا استحصال کرنا بند کیوں نہیں کرتا؟ غریب لوگ بغاوت کیوں نہیں کرتے؟ سرمایہ دار طبقے کے مقابلے میں مزدور طبقے کی اکثریت ہے۔ پھر بھی یہ لوگ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ اسی لیے تو وہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے آخر میں مزدور طبقے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ دنیا کے مزدورو، ایک ہو جاؤ۔(14) کریم بخش بھی غریبوں کی اسی ذہنیت کو سوچ کر ذہنی اذیت میں مبتلا ہے کہ غریب لوگ کیوں ہر ظلم اور زیادتی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر سہہ لیتے ہیں۔ "پتا نہیں یہ کتنی صدیوں سے ہمارے دماغوں کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ہمیں بچپن سے صرف فرائض بتائے جاتے ہیں حق کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔"(15)

مارکس اور اینگلز کا کہنا ہے کہ کسی بھی معاشرے کا طاقتور اور با اثر طبقہ (بورژوا) اس معاشرے کی روایات کو ترتیب دیتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے حکمران طبقے کے نظریات ہی اس معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں۔ پرولتاری طبقہ ان ہی نظریات کو اپناتا ہے جو کہ بورژوی طبقہ اپنے لیے بناتا ہے۔ پرولتاری طبقہ ان نظریات سے پہلو تہی کرنے کی استطاعت میں ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے تو کریم بخش اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہے کہ غریبوں کو ان کے حق کے لیے آواز اٹھانے سے روکنے والے ان کے اپنے والدین ہوتے ہیں۔ وہ گھبرا کر خوف زدہ ہو کر الٹا اس استحصالی طبقے سے بھی زیادہ سختی کرتے ہیں جو ان کی عزت نفس کو اپنے پاوں کی ٹھوکروں سے کچلنے کا ہنر اپنی وراثت میں پاتے ہیں۔

التھسر (Althusser) نے بھی اپنی کتاب " Ideology and Ideological State Apparatus " میں معاشرے کی اس تقسیم کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا کہ کسی بھی معاشرے میں دو بنیادی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ بالائی ڈھانچہ اور بنیادی ڈھانچہ۔ کسی بھی معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ یہ بورژوا طبقہ ہی بناتا ہے اور اسی بنیادی ڈھانچے سے کسی بھی معاشرے کا بالائی ڈھانچہ نمو پاتا ہے جس میں ثقافت، تصورات، فنون، مذاہب، قوانین اور کئی دیگر عوامل شامل ہوتے ہیں۔ اس کے مطابق ثقافت اور دیگر عوامل غیر نظریاتی اور آزاد نہیں ہوتے بلکہ تعین کار ہوتے ہیں جن کو معاشی بنیادیں متعین کرتی ہیں۔ ثقافت کے بارے میں یہ تصور Economic Determinism کہلاتا ہے یعنی کہ بورژوا طبقے کی اپنی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر جیسا چاہیں قانون بنائیں اور جو چاہیں کریں۔ ان سے کوئی بازپرس کرنے والا نہیں۔ کریم بخش اسی انداز میں سوچتا ہے کہ "دولت بھی کیسی عجیب چیز ہے کون کہتا ہے کہ اس سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی۔[16]

مارکسی فلسفہ ہمیں یہ ہی بتاتا ہے کہ امیر اور با اثر طبقہ ہی کسی بھی سماج میں ثقافتی اقدار، اعتقادات اور روایات بناتا ہے۔ محکوم طبقہ حقائق کو ان کی حقیقی صورت میں دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے یہ ایک ایسا سماجی عمل بن جاتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قبول عام کی سند مل جاتی ہے۔ جب کوما میں پڑی ہوئی شہزادی کسی ہسپتال کے عملے کی حرص و ہوس کا نشانہ بنتی ہے تو بجائے اس مجرم کو سزا دینے کے ہسپتال کے مالکوں کو ہسپتال کی بدنامی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور وہ بات کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور کریم بخش کو یقین ہوتا ہے کہ اب کسی بھی وقت شہزادی کو زہر کا ٹیکہ لگا کر ہسپتال کی نیک نامی بچا لی جائے گی کیوں کہ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ با اثر حکمران طبقے کے پاس ہی سب اختیارات ہوتے ہیں۔ التھسر کے نزدیک حکومت ایک سیاسی کنٹرول ہے جو اپنی طاقت کا استعمال اس وقت کرتی ہے جب اسے ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا یہ نظریہ Cultural Hegemony کے تصور کے بہت نزدیک ہے جو اطالوی مارکسی انتونیو گرامشی (. Antonio Gramsci 1891-1934) نے Theory Of Cultural Hegemonh میں دیا تھا جس میں حکمران طبقے کی سماجی بالا دستی کا ذکر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمام سماجی، معاشی، اور سیاسی اقدار و

اعتقادات کو حکمران طبقہ ہی معاشرے میں رائج کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا نقطۂ نظر پوری دنیا کا نقطۂ نظر بن جاتا ہے اور ان کے ہی تصورات اور نظریات کسی بھی سماج کی ثقافتی اقدار بن جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نظریات اعلی طبقے کے مفادات کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ معاشرے میں ان ہی کی بالادستی قائم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کریم بخش اس با اقتدار طبقے کو بھیڑیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے:

"بھیڑیوں کی اس دنیا میں، اس حرص و ہوس کی دنیا میں ایسا اندھیرا ہوا ہے کہ شیطان نے بھی اپنا چہرا شرم سے جھکا لیا ہو گا۔"(17)

در اصل پورے سماج میں ہی یہ چلن عام ہو جاتا ہے کہ با اثر افراد اپنے قول و فعل میں خود مختار ہیں۔ محکوم طبقے کو ان کی بالادستی ہر صورت میں تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ یہ حکمرانوں کی یک ایسی چال ہے جس کے ذریعے عام عوام کو بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ التھسر کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہم پر یہ چال چلتا ہے اور ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم آزاد ہیں جب کہ حقیقت میں محروم طبقے پر چیزیں تھوپی جاتی ہیں اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی اسے ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ہی تو التوا interpellation ہے۔ جو کہ التھسر کی اصطلاح ہے جس کا مقصد عوم کو یہ یقین دلانا ہے کہ وہ سماج کی ان حکومتی طاقتوں کے اثر ورسوخ کے باوجود آزاد ہیں اور ان کے پاس ان تلخ حقائق کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو کریم بخش سب کچھ جاننے کے باوجود شہزادی کو انصاف نہیں دلا سکتا بلکہ چپ چاپ ہسپتال کے مالکوں کی بے رحمی کو دیکھتا ہے اور ان کی بے حسی پر گریہ کناں بھی ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ اپنی آواز بلند کرے گا تب بھی اس کی کہیں شنوائی نہیں ہو گی لیکن اس کے باوجود اس نے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ اسی لیے وہ بیہوش پڑے دلدار کو اپنی لاچاری اور بے بسی ان الفاظ میں بتاتا ہے:

"غریبوں کی آواز شاید منہ سے نکلنے کے بعد راستے میں ہی کہیں کھو جاتی ہے۔ امیروں کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ میری آواز بھی چمکیلے فرشوں والے طویل برآمدوں میں معلق رہی۔ بند کمروں کے اندر بیٹھے اجلے لباس والوں کے بہرے کانوں تک نہ پہنچی۔"(18)

مارکسزم یہ ہی تو بتاتی ہے کہ ہر سماج کی تشکیل میں معاشی اور اقتصادی بنیاد ہی کارفرما نظر آتی ہے۔ ہر معاشرے کے افکار، خیالات سے لے کر رہن سہن کے اصولوں تک ہر معاملے میں برسر اقتدار طبقے کی ہی مرضی چلتی آئی ہے۔ غریب لوگ اپنی بے بسی اور لاچاری کے ساتھ ان اصولوں کو مانتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے جب کریم بخش کو جب ڈاکٹر اس کے دوست دلدار کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ وہ کسی وقت بھی ہوش میں آسکتا ہے تو وہ دل میں لاکھ کڑھنے کے باوجود زار و قطار روتے ہوئے بے اختیار یہ دعا مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

"کاش! وہ امیر آدمی اپنے ضمیر کا اطمینان نہ خریدتا اور ان لوگوں کا علاج نہ کرواتا۔ کاش!
یہ تینوں بھی اسی طرح مرجاتے جیسے سب غریب مرتے ہیں۔"(19)

کارل مارکس کہتا ہے کہ امیر طبقہ اپنی بے جاہٹ دھرمی کی وجہ سے ہمیشہ غریبوں کو ایسی ہی بے بسی کی زندگی جینے اور لاوارثوں کی طرح مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح غریبوں کا استحصال کرتا آیا ہے اور تب تک کرتا رہے گا جب تک اس سماجی نظام کو بدلنے کی سعی نہ کی جائے۔ کارل مارکس اور اس کے پیروکاروں نے اس سماجی نظام کو بدلنے کے لیے اپنی آواز بلند کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر طاقت مزدور طبقے کے ہاتھ میں آجائے تو معاشرے کا یہ طبقاتی فرق خود بخود ختم ہو جائے گا اور ایک ایسا صحت مند اور توانا سماجی نظام وجود میں آئے گا جو ہر قسم کے ظلم و جبر اور استحصال سے پاک ہو گا۔ اسی کو وہ اشتراکی سماج کا نام دیتے ہیں۔ اسی سماج کا تصور فریڈرک اینگلز نے کارل مارکس کی کتاب "اجرتی محنت اور سرمایہ" کے مقدمہ میں دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہمارے سماجی نظام میں جو افراتفری بپا ہے اس کا انسداد کرنا ضروری ہے۔ اس کا دور کرنا جتنا مشکل ہے اتنا آسان بھی ہے۔ آج ایک نئے سماجی نظام کے امکانات قوی تر ہوتے جا رہے ہیں جن میں طبقاتی کشمکش باقی نہیں رہے گی۔ اس عدم طبقاتی سماج میں ہر فرد کے لیے مساوی حقوق اور مناسب حالات رہیں گے۔ مزدوروں کی طاقت میں دن بہ دن اضافہ اور ان کی جماعت میں اتحاد ایک نئے سماجی نظام کی بشارت دے رہا ہے۔ مزدور بھی اس نئے نظام کے لیے آہنی عزم کے ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔"(20)

فرحت پروین کا افسانہ "آنکھیں نہ کھولنا" ایک ایسی فکری کاوش ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے غیر منصفانہ ڈھانچے پر کڑی تنقید کرتی ہے اور مارکسی نظریات کی روشنی میں طبقاتی استحصال کو واضح کرتی ہے۔ اس کہانی کے کردار، واقعات، اور مناظر اس امر کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں کہ معاشرتی ناہمواری کس طرح غریب طبقے کی زندگیوں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ مارکسی تنقید اس افسانے کو ایک بیداری کی صدا قرار دیتی ہے جو پرولتاری طبقے کو اس کے استحصال کے خلاف سوچنے اور آواز اٹھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ادبی جمالیات کا حامل ہے بلکہ ایک سماجی شعور کا حامل بیانیہ بھی ہے، جو قارئین کو جھنجھوڑتا ہے اور انہیں موجودہ نظام پر سوال اٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو مارکسی نظریہ ادب سے ہم آہنگ ہے کہ ادب کو محض تفریح یا تزئین کے بجائے، ایک مؤثر تبدیلی کے آلے کے طور پر استعمال ہونا چاہیے۔

حواشی وحوالہ جات

1-https://www.nawaiwaqt.com.pk/11-Nov-2020/1244329

2۔ کارل مارکس، داس کیپٹل: جلد اول، دوم (مترجم: محمد تقی)، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص53

3۔ مارکس، اینگلز، کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو Comunist Menisto، مترجمہ: سویت یونین، 1888ء، ص36

4۔ ایضاً، ص 18

5- ایضاً، ص 78

6۔ ایضاً، ص78

7۔ عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1951ء، ص73-327

8۔ سلیم اختر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص177

9۔ لئین ٹراٹسکی، دی ینگ لین، 1972ء، دیباچہ

10۔ سلیم اختر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص 181

11۔ لوئس التھسر، فار مارکس، فرانس، 2005، ص261

12۔ الیاس بابر اعوان، بنیادی تنقیدی تصورات، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ص181

13۔ فرحت پروین، افسانہ "آنکھیں نہ کھولنا" مشمولہ: کانچ کی چٹان، جہانگیر بکس، ص 18

14۔ مارکس، اینگلز، کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو Comunist Menisto، مترجمہ: سویت یونین، 1888ء، ص78

15۔ فرحت پروین، افسانہ "آنکھیں نہ کھولنا" مشمولہ: کانچ کی چٹان، جہانگیر بکس، ص 18

16۔ ایضاً، ص 19

17۔ ایضاً، ص 20

18۔ ایضاً، ص21

19۔ ایضاً، ص21

20۔ مارکس، اینگلز، اجرتی محنت اور سرمایہ، مترجم: میر عابد علی، اشاعت گھر، حیدر آباد، 1943ء، ص8-9

References in Roman Script:

1. https://www.nawaiwaqt.com.pk/11-Nov-2020/1244329
2. Karl Marx, Das Kapital: Jild Awwal, Doum (Mutarjim: Muhammad Taqi), Anjuman Taraqqi Urdu, Karachi, p. 53
3. Marx, Engels, Communist Party ka Manifesto (Communist Menifesto), Mutarjima: Soviet Union, 1888, p. 36
4. Ibid, p. 18

5. Ibid, p. 78
6. Ibid, p. 78
7. Ibadat Barelvi, Urdu Tanqeed Ka Irtiqa, Anjuman Taraqqi Urdu, Karachi, 1951, p. 327–73
8. Saleem Akhtar, Tanqeedi Dabistaan, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2009, p. 177
9. Leon Trotsky, The Young Lenin, 1972, debacha
10. Saleem Akhtar, Tanqeedi Dabistaan, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2009, p. 181
11. Louis Althusser, For Marx, France, 2005, p. 261
12. Ilyas Babar Awan, Bunyadi Tanqeedi Tasawuraat, Aks Publications, Lahore, p. 181
13. Farhat Parveen, Afsana "Aankhen Na Kholna", Mashmula: Kaanch Ki Chattan, Jahangir Books, p. 18
14. Marx, Engels, Communist Party ka Manifesto (Communist Menifesto), Mutarjima: Soviet Union, 1888, p. 78
15. Farhat Parveen, Afsana "Aankhen Na Kholna", Mashmula: Kaanch Ki Chattan, Jahangir Books, p. 18
16. Ibid, p. 19
17. Ibid, p. 20
18. Ibid, p. 21
19. Ibid, p. 21
20. Marx, Engels, Ajrati Mehnat Aur Sarmaya, and Mutarjim: Meer Abid Ali, Ishaat Ghar, Hyderabad, 1943, p. 8-9